اردو افسانے میں بچوں کے مسائل کی عکاسی

فائزہ تنویر

Abstract:

It is said that literature is life as it reflects different aspects of life. Writers cover every fact of life, including social issues, in their writings. As such, children which are an important segment of any society have also been expensively covered in Urdu literature. Urdu short stories in particular have focused on social, economic, psychological, sexual and physical issues faced by children. This paper deals with the children characters and issues presented in Urdu short stories, who were abused in different ways by the society.

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات دوسروں کو بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انسانی خواہش ''کہانی'' کی بنیاد بنتی ہے۔ قدیم زمانے کی ''کہانی'' دور جدید میں ''افسانہ'' کہلائی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں لکھی گئی نثری داستانیں مافوق الفطرت عناصر سے مزین تھیں۔ افسانہ بیسویں صدی میں انگریزی ادب سے اردو ادب میں آیا۔ سائنسی دور کی تیز رفتار زندگی نے طویل داستانوں کی جگہ ''افسانہ'' جیسی مختصر صنف کو دوام بخشا۔ اکیسویں صدی کے آتے آتے اردو افسانہ اپنے اندر متنوع موضوعات، زبان و بیان کے تجربات اور مختلف اسالیب کو سمو چکا ہے۔ دیہی زندگی کی پیش کش، سرمایادارانہ نظام کی تباہ کاریاں، فسادات میں رونما ہونے والے واقعات، حقیقت نگاری، علامت نگاری، تجریدیت، انسانی نفسیات کی عکاسی، خانگی زندگی کے اُتار چڑھاؤ، بچوں کے نفسیاتی و جذباتی مسائل، طبقاتی ناہمواری جیسے متنوع موضوعات اردو افسانے میں جگہ پا چکے ہیں۔ عظیم الشان صدیقی ''افسانے کی فکری و فنی جہات'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ تنوع پسندی اور انفرادیت جدید افسانے کا امتیاز ہی نہیں بلکہ اس کی مجبوری بھی ہے۔ افسانہ صنعتی تہذیب کا مرہونِ منت ہے اور صنعتی تہذیب کی تنوع پسندی اور برق رفتاری اتنا موقع ہی نہیں دیتی کہ مختصر سی مدت میں زندگی سے تعلق رکھنے والے واقعات و محسوسات یا جذبہ و خیال مکمل تجربے و مشاہدے یا جملہ حواس کا حصّہ بن

سکیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض اوقات ان پر گرفت مضبوط ہونے سے قبل ہی ڈھیل پڑنے لگتی ہے۔ لیکن یہ گریز پا لمحے اپنے اختصار کے باوجود دل و دماغ پر ایسے گہرے، تیکھے اور نوکیلے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ اظہار ناگزیر ہو جاتا ہے۔''[1]

ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم چند نے دیہاتی زندگی، مزدور و کسان کے مسائل اور غربت کی چکی میں پسے عوام کو افسانے کا موضوع بنایا۔ پریم چند کی اس روایت سے متاثر ہونے والے ادیبوں میں سدرشن، ل احمد اکبر آبادی، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے نام اہم ہیں۔ پریم چند کی حقیقت پسندی کے اس رجحان کے متوازی رومانویت کا رجحان سامنے آیا جس کی بنیاد سجاد حیدر یلدرم نے رکھی۔ اس رجحان کو فروغ دینے میں نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری کا نمایاں کردار ہے۔

۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کی نو کہانیوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ''انگارے'' منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا اور افسانہ نگاروں نے مارکسیت کے نظریات کے زیر اثر فرد اور سماج کی کشمکش کو موضوع بنانا شروع کر دیا۔ قمر رئیس، ترقی پسند تحریک کے دور عروج کو اردو افسانے کا عہد زریں قرار دیتے ہیں۔''[2]

ترقی پسند نظریہ ادب سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اختر حسین رائے، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی اور عصمت چغتائی کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۹۳۹ء کے قریب افسانے میں داخلی و باطنی ٹکراؤ کو زیادہ اہمیت ملنا شروع ہو گئی تھی اور یہیں سے جنسی و نفسیاتی کردار نگاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ ''نفسیاتی حقیقت نگاری'' کے حوالے سے اہم افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش اور ل۔ احمد شامل ہیں۔ بعد ازاں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، حسن عسکری اور ممتاز مفتی نے نفسیاتی و جنسی پہلوؤں پر جبکہ حسن عسکری نے خاص طور پر آزاد تلازمہ خیال اور شعور کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے اردو افسانے کو نیا رنگ دیا۔ دیگر افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، عزیز احمد، ممتاز شیریں، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، شمس آغا، رحمان مذنب، آغا بابر اور امجد الطاف وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء کے عرصہ میں فسادات، ہجرت اور نقل مکانی کے موضوعات پر لکھے گئے افسانے سامنے آئے۔ تقسیم اور اس کے بعد ہونے والی خوں ریزی اور انتشار نے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا تھا

اور افسانہ نگاروں نے بے رحمی اور اخلاقی قدروں کے تنزل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ فسادات کے حوالے سے کم و بیش ہر افسانہ نگار نے افسانے لکھے۔ تاہم کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، قدرت اللہ شہاب، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور فرخندہ لودھی کے نام قابل ذکر ہیں۔ فسادات کا موضوع، افسانے پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء کے عرصے میں اردو ادب میں جدیدیت کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے علامت نگاری اور تجریدیت کو عروج بخشا۔ انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، انور سجاد، دیویندر اس، رشید امجد، خالدہ حسین، احمد ہمیش، سمیع آہوجہ، مظہر الاسلام، زاہدہ حنا، مرزا حامد بیگ، امراؤ طارق، آصف فرخی، قمر الاسلام اور اسد محمد خان وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتیجے میں پاکستانی افسانے میں حب الوطنی کے جذبات سے مزین ایک رجحان سامنے آیا۔ اس سلسلے میں غلام الثقلین نقوی، حجاب امتیاز علی، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، الطاف فاطمہ، فضل قدیر، مسعود مفتی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد ارض وطن سے محبت کے جذبے کو مزید فروغ ملا اور اردو ادب میں اس میلان نے ارضی اور ثقافتی رجحان کا روپ دھار لیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ، افسانہ نگاروں کے لیے انتہائی صدمے کا سبب بنا۔ اس المیے پر لکھنے والوں میں انتظار حسین، مسعود اشعر، مسعود مفتی، اختر جمال، الطاف فاطمہ، اے خیام، شہزاد منظر، اسد محمد خان کے نام نمایاں ہیں۔ ۱۹۸۰ء تا ۲۰۰۰ء کے عرصے میں اردو افسانے میں مختلف موضوعات پر لکھا گیا۔ افسانہ نگاروں نے فلسطینی اور کشمیری بھائیوں کے دکھ کو اپنے افسانوں میں سمویا۔ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانے کے موضوعات کو مزید وسعت ملی۔ ۹/۱۱ کے حادثے کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات، برصغیر میں نیٹو افواج کے موجودگی، القاعدہ اور طالبان کے انسانیت سوز مظالم اور پاکستان میں جابجا ہونے والے بم دھماکوں نے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ اکیسویں صدی کے اہم افسانہ نگاروں میں اسد محمد خان، رشید امجد، حسن منظر، مسعود اشعر، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، آصف فرخی، نیلم احمد بشیر، طاہرہ اقبال، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر لیاقت علی کے نام نمایاں ہیں۔

جدید اردو افسانے میں علامتی، نفسیاتی، تجریدی زاویوں کے ساتھ عصری میلانات کو بھی کمال ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ افسانہ نگار عالمی و قومی سطح کے مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشرتی

پہلوؤں کو بھی حقیقت نگاری سے پیش کر رہے ہیں۔ خاندان، معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے اور اس کا مرکزی رکن ''بچہ'' ہے۔ ''بچے'' کا موضوع اردو افسانے کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہا۔ اردو کے چند بڑے افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد کے افسانوں میں بچے کو خصوصیت اہمیت دی جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بچے نفسیاتی، جذباتی اور جنسی مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کم عمر بچوں سے سخت مشقت بھی کروائی جاتی ہے۔ طبقاتی ناہمواری، جسمانی معذوری اور والدین کی ناچاقی بھی بچوں کی نفسیات پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ بچوں کے مختلف مسائل میں سب سے اہم اور توجہ طلب مسئلہ ''نفسیاتی و جذباتی الجھاؤ'' کا ہے۔ صحت مند بچے معاشرے کی بنیادی ضرورت ہیں۔ جسمانی طور پر فعال اور نفسیاتی و جذباتی اعتبار سے مطمئن بچے ہی مستقبل میں بہتر شخصیت کے مالک بنتے ہیں۔ عام طور پر والدین بچوں کو وہ اپنی گھریلو یا پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے بچوں کو وہ اہمیت نہیں دے پاتے جو انہیں دی جانی چاہیے یا پھر اکلوتے بچوں کو غیر معمولی اہمیت دے دی جاتی ہے، دونوں صورتیں ہی بچوں میں نفسیاتی و جذباتی بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ اردو افسانے میں نفسیاتی مسائل کی عکاسی کے حوالے سے اہم نام ''ممتاز مفتی'' کا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مرد و خواتین کے نفسیاتی مسائل کے ساتھ بچوں کی نفسیات کو بھی بیان کیا ہے۔ افسانہ ''نیلی میں فیضو چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنتی ہے۔ رات کو وہ رضائی لے کر ساکت لیٹ جاتی ہے تاکہ سب یہ سمجھیں کہ وہ سو گئی ہے۔ حقیقت میں وہ جاگ کر باتیں سنتی ہے۔ یہ حرکات اس کی نفسیاتی کمی کو سامنے لاتی ہیں۔ متوسط طبقے میں عموماً بڑوں کی محفل سے بچوں کو اٹھا دیا جاتا ہے اور یہی تجسس انہیں چوری چھپے باتیں سننے پر مجبور کرتا ہے۔

سعادت حسن منٹو، بچے کی ان نفسیاتی الجھنوں کو موضوعِ افسانہ بناتے ہیں جو بلوغت کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں مگر ان کے اظہار کی ہمارے ہاں کوئی روایت نہیں ملتی۔ دھواں، بلاؤز اور پھاہا، بچوں کی ان نفسیاتی الجھنوں کے عکاس افسانے ہیں۔ اس حوالے سے ''منٹو۔۔۔۔۔ایک مطالعہ'' میں وارث علوی بیان کرتے ہیں: ''تینوں (دھواں، بلاؤز، پھاہا) کہانیاں بچوں کی نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں کوئی جنسی بگاڑ نہیں۔''[۳]

''دھواں'' بلوغت کی عمر میں بچوں کے اندر پیدا ہونے والے جذبات کو سامنے لانے والا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ''مسعود'' کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو جنسی بیداری کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے

وہ اپنے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کر رہا ہے مگر سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسے قصائی کی دکان پر لٹکا گرم گوشت۔۔۔، عجیب سرور کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔ اس میں ایسی جسمانی و ذہنی تبدیلیوں پیدا ہو رہی ہیں جنہیں وہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے گھر کے دبے ہوئے ماحول میں جنسی تعلیم اور جنسی تبدیلیوں سے آگاہی کا تصور نہیں ہے بلکہ ایسی باتوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے جسمانی تبدیلیوں کے اظہار کے لیے کمرے کے گرم گوشت کو استعمال کیا ہے تاکہ جسمانی گوشت کی حدت اور جنسی عمل کا گہرا تعلق واضح ہو سکے۔ افسانے میں شروع سے آخر تک ایک بچے کے احساسات اور اس کے اندر پیدا ہونے والی کیفیات کو نفسیاتی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مسعود کے احساسات بھی دھند کی فضاؤں میں ہیں۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی اس جنسی بیداری کی وجہ اس کے گھر کا ماحول ہے۔ اس کا باپ دن کے وقت سر دیوانے کے بہانے بیوی کو کمرے میں مصروف رکھتا ہے۔ ماں باپ کے اس عمل کے کھوج کا تجسس اُسے بہن کی پنڈلیاں باتے ہوئے بھی ہیجانی کیفیت میں لے جاتا ہے۔

''پھاہا'' افسانہ آغاز شباب میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر بچی ''نرملا'' کی کہانی ہے۔ موسم گرما میں زیادہ آم کھانے کی وجہ سے گوپال کے پھوڑا نکل آتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے چھپ کر پھوڑے پر روئی کا پھاہا رکھتا ہے۔ گوپال کی بہن نرملا اسے غور سے دیکھتی ہے اور گوپال کے جانے کے بعد اپنے سینے کے ننھے ابھار پر بھی پھاہا رکھتی ہے۔ وہ بھائی کا پھوڑا دیکھ کر نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی چھاتی پر بھی دو ننھے ابھار تھے۔ اس نے سوچا کہ دو ماہ پہلے اس نے دو انڈے کھائے تھے اس لیے اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ نرملا کی عمر کے بچوں کی نفسیاتی الجھنوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ماں باپ بچوں کو ان کی عمر کے مطابق جنسی و جسمانی تبدیلیوں سے آگاہ نہیں کرتے اور بچے گھر میں ہونے والے مختلف واقعات کو دیکھ کر اپنی عقل کے مطابق نتائج نکالتے ہیں۔

''بلاؤز'' بھی آغازِ شباب میں بچوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اثرات پر مبنی عمدہ افسانہ ہے۔ ڈپٹی صاحب کی بیٹیاں شکیلہ اور رضیہ روشن خیال بہنیں ہیں۔ وہ اپنے نو عمر ملازم مومن کے سامنے ہی بلاؤز سیتی اور پہنتی ہیں۔ بلاؤز دیکھ کر مومن کے دماغ میں مختلف قسم کے خیالات کا ہجوم پیدا ہو جاتا ہے مگر اس کی کیفیات کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ دراصل مومن اور شکیلہ، دونوں، نو بالغ ہیں اور جنسی اور جسمانی تبدیلیوں سے گزر رہے رہیں۔ مگر جسموں کے ایسے انو کے تقاضے کی تفہیم ان کے خام اور ناتجربہ کار ذہین کرنے سے قاصر ہیں۔ شکیلہ کے بلاؤز تیار کرنے کے عمل میں مومن کی جنسی و ذہنی حالت مضطرب

ہو جاتی ہے اور اس کی اس مضطرب نفسیاتی کیفیت کی وجہ شکیلہ کا لاپرواہ انداز ہے۔ منٹو نے افسانے میں ملازم بچوں کے ایسے مسائل کو بہت گہرائی سے بیان کیا ہے۔

> ''وہ انقلاب جس سے مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور پھر مومن نوکر تھا۔۔۔ نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔''[۴]

بچوں کی نفسیات پر والدین کی ناچاقی یا علیحدگی بھی بُرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ بچے کی شخصیت پر والدین کے رویے اور برتاؤ کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ آغا سہیل کے افسانے ''کھویا ہوا بچہ'' کا حامد سوتیلی ماں کے مظالم کا شکار ہے۔ دوسری شادی کے بعد باپ بھی اجنبی بن چکا ہے۔ سوتیلی ماں کی شکایتوں کی وجہ سے اُسے مار پڑتی ہے۔ آخر کار، ایک دن والدین کے مظالم سے تنگ آ کر وہ بھاگ جاتا ہے۔ حالات اُسے سیٹھ ہارون کے گھر لے جاتے ہیں، جہاں اُسے سب کچھ مل جاتا ہے مگر ''کھویا ہوا بچہ'' جسے حامد کہتے تھے دوبارہ نہ ملا۔ والدین کے درمیان پیدا ہونے والی دوریاں اور سوتیلی ماؤں کے برے رویے، بچوں کی نفسیات کو بگاڑ دیتے ہیں اور بچے اپنی شخصیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

افضل توصیف کے افسانے ''آلو شوربہ'' میں دو سالہ جڑواں یتیم بچے عمران اور نعمان ہیں۔ ان کے والدین حادثے میں انتقال کر گئے۔ بوڑھی دادی نے انہیں سینے سے لگایا مگر جب وہ پانچ سال کے ہوئے تو وہ بھی انتقال کر گئی۔ نعمان کو پھوپھی لے گئیں اور عمران خالہ کے گھر چلا گیا۔ دونوں یتیمی میں پل تو گئے مگر والدین کی کمی ان کی ذات میں خلا چھوڑ گئی۔

بعض اوقات تلخ واقعات و سانحات، بچے کے جذبات کو مجروح کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی مثال سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''تماشا'' ہے۔ اس افسانے میں سعادت حسن منٹو نے ایک معصوم بچے خالد کی زبانی پورے ہندوستان کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ انگریز فوج جلیانوالہ باغ میں خون کی ہولی کھیلتی ہے تو خالد فائرنگ سے زخمی ہونے والے ایک لڑکے کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ خالد کے رونے پر اس کی ماں تسلی دینے کے لیے کہتی ہے کہ لڑنے نے شرارت کی ہو گی اسی لیے سزا ملی ہے۔ خالد رو کر اللہ سے دعا کرتا ہے:

''اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اِس لڑکے کو پیٹا ہے۔ اچھی طرح سزا دے اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے..... میں نے پہاڑے یاد نہیں کیے۔ اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے..... اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں، تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا۔''[۵]

بچوں کے جذبات میں الجھاؤ کا سبب، بڑوں کے سخت رویے بھی بنتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کا لکھا افسانہ ''سب کا مالک'' اس کی اہم مثال ہے۔ ''رضیہ'' ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اُسے سائیں بابا بتاتے ہیں کہ سب کا مالک اللہ ہے مگر مولوی صاحب، بڑی حویلی کے سربراہ کو سب کا مالک کہتے ہیں۔ ہسپتال کی عیسائی نرس نے حضرت عیسیٰ کو سب کا مالک قرار دیا۔ ''تم مالک پر بھروسہ رکھو'' نرس منازی نے تصویر چوم کر کہا۔''[۶]

الغرض اُسے ''سب کا مالک'' کے حوالے سے مختلف لوگوں سے مختلف وضاحتیں سننے کو ملتی ہیں اور وہ پریشان ہو جاتی ہے۔ قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھا گیا یہ افسانہ ہمارے سماجی رویوں کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق، ''نقوش'' افسانہ نمبر میں اپنے مضمون ''شہاب کے افسانے'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''سب کا مالک، میں ہمیں سماج کے مختلف طبقاتی کرداروں کی جھلک ملتی ہے۔ سائیں بابا کے لیے سب کا مالک اللہ ہے لیکن مولوی صاحب کا درس کچھ اور ہے۔ رضیہ کے دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ افسانہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔''[۷]

بچوں کے اندر سب سے قوی جذبہ ''محبت'' کا ہے۔ جانور ہوں یا انسان، بچہ اپنی محبت سے بچھڑ کر جذباتی عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے ''گاتو، گل ٹریا، تلاش، بابا اور امی'' بچوں کے جانوروں اور انسانوں سے محبت بھرے جذبات سامنے لانے والے افسانے ہیں۔ ''گاتو'' کے کردار قیوم کو اپنی بلی ''گاتو'' سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اس کے باپ کا مالک، اپنی بیوی کے کہنے پر قیوم کی بلی لے لیتا ہے۔ قیوم کے لیے گاتو سے بچھڑنا، بے پناہ تکلیف کا سبب بنتا ہے۔ وہ اللہ کے حضور اپنی عرضی یوں پیش کرتا ہے:

''وہ پھر سسکیاں بھرنے لگا اور گرم گرم آنسو اس کی لرزتی ہوئی یخ ٹانگوں پر پھسلنے لگے۔ قیوم نے ذرا سی اونچی آواز میں اللہ میاں کو بلایا۔ سر گھٹنوں میں اور گھسیڑا تو ماتھے کے زخم میں زور کا درد اٹھا۔ اور کرب کی شدت سے قیوم بلبلا اُٹھا اور روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اللہ میاں جی چاہے میں مر جاؤں۔ چاہے مجھے مار دو پر میری گا تو مجھے لے دو۔ میں گا تو لے کر جاؤں گا۔ چاہے مجھے چڑیلیں کھا جائیں۔ بھوت کھا جائیں۔ اللہ میاں جی میری بلی لے دو۔''۸

اشفاق احمد، بچوں میں محبت کے جذبے اور اس جذبے کے مجروح ہونے کے بعد پیدا ہونے والی کیفیات کو اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ سید وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' میں اشفاق احمد کے افسانوں میں بچوں میں محبت کے غالب جذبات کو یوں بیان کیا ہے۔

''گھریلو زندگی میں یوں تو انسان کی معاشرتی زندگی کے مختلف رشتے محبت کے اس وسیع مفہوم کے ترجمان ہیں لیکن محبت کا اصل جوہر اس وقت کھلتا ہے جب بچے اس رشتے کے تاروں کو جوڑتے ہیں۔ زندگی میں بچوں کا وجود محبت کی سب سے سچی اور سب سے مکمل تفسیر ہے۔ یہ اس محبت کی ایک سطح ہے جو ہمیں اشفاق احمد کے افسانوں میں دوسری چیزوں پر غالب اور حاوی نظر آتی ہے۔''۹

بچوں کے نفسیاتی و جذباتی الجھاؤ کا سبب عموماً گھریلو ماحول، والدین کی ناچاقی یا علیحدگی، بڑوں کی بے جا سختی، تلخ واقعات و سانحات بنتے ہیں۔ جس طرح بچے کی جسمانی صحت کے لیے خوراک یا ورزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح نفسیاتی صحت کے بھرپور ہونے کے لیے اس کے ماحول اور اہلِ خانہ کے ساتھ تعلقات کا خوش گوار ہونا ضروری ہے۔

افسانہ نگار معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل کو گہری نظر سے دیکھتا ہے اور ان پر قلم اٹھاتا ہے تاکہ معاشرہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ محنت مزدوری کرنے والے بچے اکثر کام کے دوران میں مختلف مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لیے ان کا عالمی دن یعنی ''چائلڈ لیبر ڈے'' ۱۲ جون کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کے منانے کا مقصد، مزدور بچوں کی ان قربانیوں کا اعتراف کرنا ہے جو انہوں نے اپنے سنہری دور یعنی بچپن کو کھو کر دیں۔ مختلف افسانہ نگاروں نے مزدوری کرنے والے بچوں کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ مزدور بچوں کا سب سے اہم مسئلہ

جنسی استحصال ہے۔ اس حوالے سے اختر حسین رائے پوری کا افسانہ ''موت'' اہمیت کا حامل افسانہ ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں کم عمر بھکاری لڑکی کے بارے میں بتایا ہے جسے شیخ جی نے اپنے گھر کام کرنے کے بہانے بلا کر زیادتی کا نشانہ بنا ڈالا۔ سعادت حسن منٹو کے افسانے ''شاداں'' میں تیرہ سالہ شاداں محنت مزدوری کرتے ہوئے جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہے اور مر جاتی ہے۔ خدیجہ مستور کے افسانہ ''ڈولی'' کا کردار ڈولی جنسی استحصال کا شکار ملازمہ ہے۔ ڈولی سے مالک ''بابو جی'' زیادتی کرتے ہیں۔ بخار کی شدت میں بڑبڑاتی ہوئی ڈولی کے الفاظ، پیٹ کی بھوک مٹانے کی خاطر مالکوں کی جنسی بھوک کا شکار ہونے والے ملازم بچوں کے درد کے عکاس ہے:

> ''بابو جی، تم کہتے تھے، اگر بڑے بابو کو معلوم ہو گیا تو وہ تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے۔ میں تمہارا نام کسی کو نہ بتاؤں گی، پر میرے بابو جی، اب تم مجھے نہ چھونا۔ اب مجھ سے دکھ نہیں جھیلا جاتا نا بابو جی..... میرے.....'' [10]

محنت مزدوری کرنے والے بچے، بعض اوقات، بہت زیادہ مشقت کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منٹو کے افسانے ''جی آیا صاحب'' اور ''قاسم'' میں ایسے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان دونوں افسانوں کے ننھے کردار نیند کی کمی کا شکار ہیں۔ افسانہ ''قاسم'' میں قاسم سخت کام سے بچنے کے لیے اپنی انگلی کو بار بار بلیڈ سے کاٹ لیتا ہے مگر زخم بگڑنے کی وجہ سے ہاتھ کاٹنا پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال ''منٹو کا اسلوب۔ افسانوں کے حوالے سے'' میں ''جی آیا صاحب'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''آیا صاحب جی میں نو عمر ملازم کے لبوں پر رہنے والا ورد ''آیا صاحب جی، آیا صاحب جی'' بھی ایک علامت کا گنجینہ بن جاتا ہے۔ جو چائلڈ لیبر اور غیر منصفانہ معاشی و معاشرتی نظام پر ایک طمانچہ ہے۔'' [11]

بچپن، عموماً کھیل تماشے سے جڑا ہوتا ہے۔ بچے کا دل، کھیل کود، کھلونے اور تماشوں کی طرف لپکتا ہے۔ بچے، بڑوں کے کہنے پر محنت مزدوری یا بھیک مانگنے پر مجبور تو ہو جاتے ہیں مگر ان کے اندر کا بچہ انہیں کھیل تماشے کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سلطان'' کم عمری میں محنت مزدوری کرنے والے بچوں کے ایسے ہی احساسات سامنے لانے والا افسانہ ہے۔ معصوم ''سلطان'' گداگری پر مجبور تو ہے مگر اس کے اندر کا بچہ ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ اس کا اندھا دادا اُسے تین

پیسے دیتا ہے کہ وہ کچھ کھا پی آئے مگر وہ مداری کا تماشا دیکھنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ دیر سے آنے کی وجہ سے دادا کو اس پر غصہ آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''سلطان'' بھکاری ہونے کے ساتھ ساتھ ننھا بچہ بھی ہے جس کا دل کھیل تماشے کی طرف ہمکتا ہے۔ فتح محمد ملک اپنے مضمون ''بچے اور مائیں'' میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بچوں کے کرداروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ''ندیمؔ ان معصوم بچوں کے مقدر سے چشمِ قدرت کی بے نیازی سے کہیں زیادہ ہم انسانوں کے وضع کردہ نظام معشیت کے ہاتھوں ان کی بربادی پر نالاں ہیں۔''[۱۲]

اس افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے بچے ''سلطان'' کی نفسیات کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے اور معاشرے کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ظالمانہ رویوں کو برہنہ کر دیا ہے۔

محنت مزدوری کرنے والے غیور بچوں کی نفسیات کو سامنے لانے والے افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''چور'' اور خدیجہ مستور کا افسانہ ''ثریا'' اہم ہیں۔ ''چور'' کا رحمان، سات آٹھ سالہ یتیم بچہ ہے۔ والدین کی وفات کے بعد پھوپھی اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے پھوپھا نے اس پر چوری کا الزام لگایا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھوپھی کا گھر چوڑ کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ گاؤں آ کر، بغیر تنخواہ کے راجہ اللہ نواز کے گھر کام کرنا شروع کر دیا۔ پھل دیکھ کر اس کا دل مچلتا مگر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ خرید نہ پاتا۔ ایک طرف ماں کی اچھی تربیت اُسے چوری کرنے سے روکے رکھتی ہے اور دوسری طرف دل پھل کھانے کو چاہتا ہے۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں غیور بچوں کے کرداروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ''ندیمؔ کے افسانوں میں بھی ان معصوم مگر نادار بچوں اور ان کی غریب مگر غیور ماؤں کے افسانوں میں بھی ان معصوم مگر نادار بچوں اور ان کی غریب مگر غیور ماؤں کے کردار بار بار ابھرتے ہیں اور اپنے مضامین میں بھی ندیم نے بچوں سے ہماری مجرمانہ غفلت کی کہانی بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کی ہے۔''[۱۳]

خدیجہ مستور کے افسانے ''ثریا'' کی ثریا ان غیور بچوں کی نمائندہ ہے جو حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھروں میں کام ضرور کرتے ہیں مگر چوری، فریب اور مانگنے جیسی برائیوں سے دور رہتے

ہیں۔ مالکن، ثریا کو کھانے کے لیے کچھ دیتی تو ثریا اپنے رہن سہن کا امیرانہ نقشہ کھینچتی کہ مالکن چپ ہو جاتی۔ ایک دن دادی کے آنے پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے گھر کھانے کے لیے کچھ بھی موجود نہ تھا مگر ثریا غیور لڑکی ہونے کی وجہ سے مانگ کر کھانا پسند نہیں کرتی۔

اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں بچوں کے جسمانی، جذباتی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں، جہاں بچوں کی نفسیات کو واضح کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے۔ بچوں کے مسائل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے بچپن میں درپیش تمام مسائل بچے کی شخصیت میں نفسیاتی بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ بچپن، انسانی زندگی کا نہایت اہم حصّہ ہے۔ زندگی کے اس اہم دور کی اہمیت سے والدین اور سماج دونوں کو آگاہ ہونا چاہیے کیونکہ صحت مند بچپن کے بغیر معاشرے کو صحت مند افراد کی بھی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ گھر کا صحت مند ماحول اور بچے کی اچھی تربیت پروان چڑھی۔ اس نسل میں مثبت اقدار اور رویے کو فروغ دیتے ہیں اور نتیجے کے طور پر ان کی شخصیت مفید، کارآمد اور بہترین بن جاتی ہے۔ جب تک بے اور ماحول میں خوش گوار تعلقات قائم رہتے ہیں۔ اس وقت تک اس کی ذہنی و جسمانی نشوونما بھرپور طریقے سے ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''تین بڑے نفسیات دان'' میں رقم طراز ہیں:

> ''بچہ کی اپنے ماحول سے عدم مطابقت ہی تمام سماجی خرابیوں اور جرائم کی جڑ ہے اور ایڈلر کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف انفرادی نفسیات کے اصولوں کے ذریعہ سے ہی ان وجوہات و بواعث کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ ایڈلر نے ماحول سے عدم مطابقت رکھنے والے بچوں کی تین اقسام گنوائی ہیں جس کے اعضاء ناقص ہیں۔ جن کو بے جا لاڈ پیار سے بگاڑ دیا گیا ہے اور وہ جو سدا پیار سے محروم رہے۔''[۱۴]

اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں تیسری دنیا کے تمام مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غریب والدین، غربت کی وجہ سے بچوں کو وہ ماحول نہیں دے پاتے جو کہ ان کا حق ہے جب کہ امیر والدین اپنے خود ساختہ مسائل میں الجھ کر بچوں کو وقت نہیں دے پاتے۔ دونوں صورتوں میں متاثر ''بچہ'' ہی ہوتا ہے۔ حالانکہ والدین کی محبت، بچے کے دل میں بھی محبت کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہے اور اُسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے اور ماحول کے باہمی تعلقات کا تعین کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ افسانے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ''بچے'' جو کہ ہمارا آنے والا کل ہیں۔ اگر ان کی نفسیات اور کردار

سازی پر آج توجہ نہ دی گئی تو ان کی شخصیت کی کجیاں اور ادھورا پن ان کی ذات اور معاشرے دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

ہمارے ادیبوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے بچوں کے بہت سے مسائل کی نشان دہی کی ہے لیکن جدید زمانے کی سائنسی ترقی اور بڑھتے ہوئے اخلاقی زوال نے بہت سے نئے مسائل کو جنم دے دیا ہے۔ بچوں میں موبائل کے بے جا استعمال، غیر نصابی سرگرمیوں کے فقدان اور بزرگوں کی صحبت سے دوری کی وجہ سے ذہنی، جذباتی اور جسمانی مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ آج کے افسانہ نگار کو اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

حواشی:

۱۔ عظیم الشان صدیقی، افسانے کی فکری و فنی جہات (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۸

۲۔ قمر رئیس، اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۸

۳۔ وارث علوی، منٹو۔ ایک مطالعہ (دہلی: وجے پبلشرز، ۱۹۹۷ء)، ص ۷۰

۴۔ سعادت حسن منٹو، بانجھ (دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۳۲

۵۔ سعادت حسن منٹو، آتش پارے اور سیاہ حاشیے (دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۸۴ء)، ص ۸۱

۶۔ قدرت اللہ شہاب، نفسانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۶

۷۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، شہاب کے افسانے مشمولہ نقوش افسانہ نمبر ستمبر (لاہور: ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۸۷

۸۔ اشفاق احمد، سفر مینا، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۳۵

۹۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک (کراچی: باب الاسلام پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۴

۱۰۔ خدیجہ مستور، مجموعہ خدیجہ مستور (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۹۵

۱۱۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، منٹو کا اسلوب۔ افسانوں کے حوالے سے (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۶

۱۲۔ فتح محمد ملک، بچے اور مائیں، مشمولہ، کھوئے ہوؤں کی جستجو (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۳ء)، ص ۷۰۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۰۶

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۱۰